title - Tazkira Shams-Ul-Ulma Mauleena Shibli Marhoom.

creator - Mohammad Mehdi

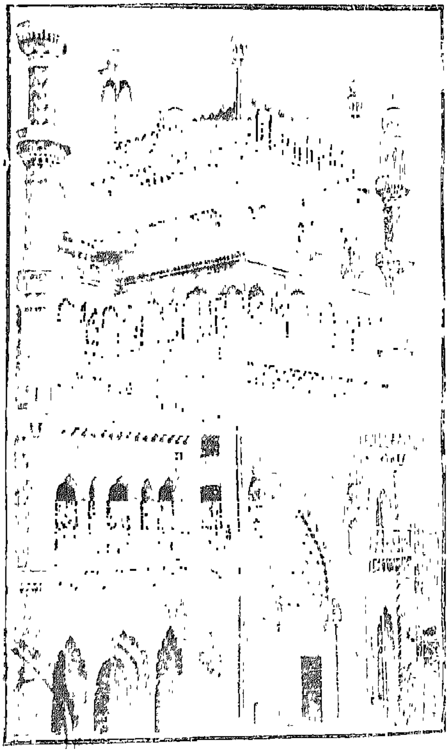
Publisher - Shams Machine Press (Agra)

Date - 1925

Pages - 61

Subjects - Shibli Nomani - Sawaneh - O - Tanqeed

بشیر پاشا سیریز



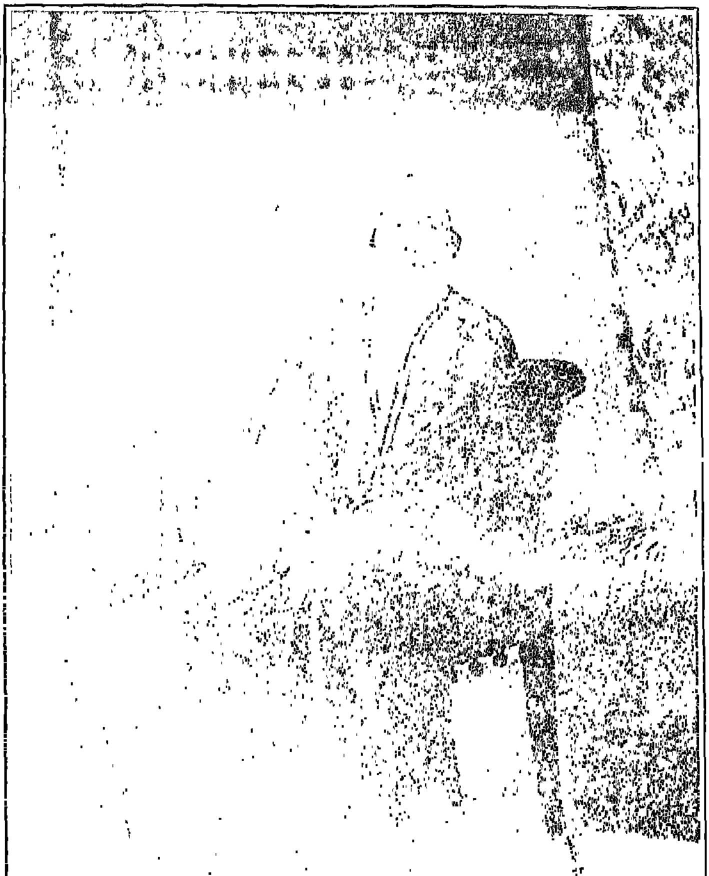
تذکرہ

شمس العلما مولینا شبلی مرحوم

مرتبہ

محمد مہدی

اسلامیہ ہائی اسکول (اٹاوہ)



تذکرۃ المشاہیر

نوجوانانِ قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے حوصلے بڑھانے کے لیے ان مشاہیرِ قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہے اور ہر ملک و ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اعظم الرجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بہ کثرت شائع کئے جاتے ہیں لیکن ہندستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں ان کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں ان عزیزوں اور دوستوں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے۔

میں اپنے پرجوش نوجوان دوست سید عبدالجلیل صاحب کا جو بمبئی میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکرگزار ہوں کہ انہوں نے نہایت تنگیِ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں ان کو طبع کرایا

میں اپنے اہل قلم نوجوانانِ قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔ اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا

محمد الطاف حسین بی اے
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جوانمرگ بشیر پاشا
مرحوم بی۔اے۔ بی۔ ٹی کے نام سے معنون کرتا ہوں
جس کی زندگی اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد قوم
کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیل تعلیم کر کے اپنی زندگی
اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

مولوی محمد امین صاحب کی فرمائش کی تعمیل میں بشیر پاشا سیریز کے لیئے اس سے قبل "تذکرہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور" لکھا تھا اور تذکرہ ہذا بھی اُسی سلسلہ کے لیئے مولوی صاحب ممدوح ہی کی فرمائش سے مرتب کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس خدمت کا اہل نہیں ہوں۔

ماخذ کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے پیش نظر "الندوہ" کی نو سالہ جلدیں، ہر دو حصص مکاتیب شبلی، رسالہ معارف مجلد اول عدد دوم بابتہ ماہ شوال سنہ ۱۳۳۴ھ = اگست سنہ ۱۹۱۶ء جس میں مولانا کی سوانح عمری کا مکمل خاکہ چھپا ہے۔ سفرنامہ روم و مصر و شام، کلیات شبلی اور معتدبہ تعداد کے نوٹ ہیں جو مولوی محمد امین صاحب نے بڑی دماغ سوزی سے تیار کیئے ہیں اسی سرمایہ سے یہ غیر مکمل تذکرہ تالیف کیا گیا ہے۔

۷- دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء

محمد مہدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(مولانا محمد شبلی نعمانی مرحوم)

مسلمانان ہندوستان کی ترقی کے لئے سر سید علیہ الرحمۃ کا جو لائحہ عمل تھا اس کے دو خاص اجزا مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و شوکت کا اظہار، اور موجودہ ذلت و نکبت کا احساس بھی تھے دوسرے کے علم بردار مولانا حالی مرحوم تھے اور پہلے کے علامہ شبلی نعمانی۔

مولانا حالی مرحوم نے اپنی مشہور معروف اور مقبول عام و خاص مسدس "" اور دوسری نظموں میں قوم کی پستی و بربادی کی ایسی صحیح تصویر کھینچی کہ ہر مخالف و موافق کو بجز اقرار کے چارہ نہ تھا اور انہیں نظموں کا اثر ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے تنزل و ادبار کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہی احساس تھا جس نے سر سید

علیہ الرحمتہ کے مشن کے لئے راستہ صاف کردیا لیکن ترقی کی تحریک کے لئے ضرورت تھی کہ ان سے گذشتہ شاندار تمدنی و علمی کارناموں کا نقشہ ان کے سامنے پیش کیا جائے یہ کام علامہ شبلی مرحوم نے انجام دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی پچھلی ترقیوں کا کافی تاریخی ذخیرہ اردو میں مہیا کردیا اور ان کی زندگی اسی تحقیق میں صرف ہوئی۔

تاریخ کے علاوہ جس میں وہ معاصرین میں نظیر نہیں رکھتے تھے فقہ، حدیث، تفسیر، ادب فلسفہ اور علم کلام میں ان کو علی وجہ الکمال بصیرت حاصل تھی۔ شاعری میں جو ان کا تفریحی مشغلہ تھا وہ اپنی امتیازی شان رکھتے تھے، فارسی میں ان کا کلام استادانہ ہے اور اردو میں جو طرز جدید (تاریخی و سیاسی شاعری) کی ایجاد کی اس کا انہیں پر خاتمہ ہوگیا۔

سرسید علیہ الرحمتہ کی تربیت نے ان کے دل میں سچا درد قومی پیدا کردیا تھا اس وقت سے وہ مدۃ العمر قومی مذہبی اور علمی خدمات میں سرگرمی سے مصروف رہے اور بعض ان کی قومی خدمات پر فخر کارنامے ہیں۔ وہ صحیح معنی میں طالب علم تھے بلکہ حریص علم، اور جس کی زندگی سرتاپا علمی زندگی ہو اس کی مثال

علامہ شبلی مرحوم سے بہتر نہیں مل سکتی۔ سطور ذیل اس اجمال کی تفسیر کریں گی۔

ولادت، اور تعلیم و تربیت

مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ قصبہ بندول ضلع اعظم گڈھ کو جو ایک شرفا کی بستی ہے مولانا کی جائے ولادت ہونے کا شرف حاصل ہوا، جب مولانا شیر خوارگی کی منزل سے گذر کر دور طفلی میں پہنچے تو اعظم گڈھ میں جہاں مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل تھے مولوی شکر اللہ نامی کے پاس ابتدائی تعلیم کے لئے بیٹھائے گئے۔ اس کے بعد میں فارسی کی تکمیل کرکے عربی شروع کی۔ پھر غازی پور میں مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی صدر مدرس مدرسہ غازی پور کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ جو اس وقت فلسفہ، منطق، ہندسہ، اور ادب، عربی کے مشہور یگانۂ عصر فاضل تھے۔ مولانا شبلی نے مولانا فاروق سے معقولات کی انتہائی تعلیم حاصل کی استاد کو اپنے شاگرد سے ذہانت وطباعی کی وجہ سے بجد انس تھا مولانا فاروق نے سچ کہا تھا انا اسد وانت شبلی۔

آخر زمانہ میں مولانا فاروق غازی پور سے مولانا کے گھر اعظم گڈھ

آ گئے تھے۔ جب مولانا شبلی ان سے تکمیل تعلیم کر چکے تو رامپور مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کے حلقہ درس میں آ کر شریک ہوئے لیکن یہاں طالب علموں نے مناظرے اور مباحثے میں اُلجھا لیا۔ اگرچہ مولانا اس وقت مناظرہ میں خوب مشّاق تھے اور اکثر معرکے جیت چکے تھے لیکن وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہ مناظرے تعلیم میں حارج تھے اس لئے اس درس گاہ سے کچھ استفادہ نہیں کیا۔ اور مولوی ارشاد حسین سے فقہ کی اونچی کتابیں پڑھتے رہے۔

رام پور میں تکمیل تعلیم کر کے لاہور آئے یہاں مولوی فیض الحسن صاحب سے ادب کی تکمیل کی مولانا کو خوش قسمتی سے استاد بھی باکمال ملے۔ مولانا فاروق چڑیاکوٹی جس طرح معقول میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اسی طرح مولوی فیض الحسن ایک باکمال ادیب تھے اور اپنے وقت کے اصمعی اور ابوتمام کہلاتے تھے' لاہور سے مولانا ' مولانا احمد علی صاحب محدث کی خدمت میں سہارن پور آئے یہاں حدیث پڑھتے رہے۔

لطف سخن اور مولویت

سنہ ۱۲۷۶ھ میں جب مولانا کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور ترمذی شریف

پڑھتے تھے اپنے بعض اعزا کے ہمراہ مکہ معظمہ گئے وہاں حج کرکے مدینہ کی زیارت سے مشرف اندوز ہوئے وہاں سے واپسی کے بعد مولانا کے دو مشغلے تھے ایک اساتذۂ اردو وفارسی کے کلام کا مطالعہ اشعر گوئی اور مشاعروں میں شرکت، دوسرے غیر مقلدی کی تردید۔

اعظم گڈھ میں ایک کتب فروش کی دکان پر اردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتے تھے کبھی کوئی دیوان گھر پر لاکر مطالعہ کرتے تھے "پیام یار" اور "اودھ پنچ" بڑے شوق سے پڑھتے تھے بعض طویل طویل نظمیں زبانی یاد تھیں اعظم گڈھ میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں مولانا میر مشاعرہ ہوا کرتے تھے فیاض ازل نے دوسرے فطری کمالات کے ساتھ جوہر شاعری بھی عطا فرمایا تھا اس لئے یہ جوہر کیونکر بیکار رہ سکتا تھا کبھی کبھی خود بھی اردو فارسی اشعار موزوں فرمایا کرتے تھے شغل تصنیف و تالیف بھی اسی زمانہ میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن مولانا نے اس وقت تک جس فضا میں پرورش پائی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ مقلدی اور غیر مقلدی کی معرکہ آرائی میں مولانا بھی نبرد آزمائی کریں۔ مولانا خود حنفی تھے اور مولوی فاروق چڑیا کوٹی اور مولوی احمد علی کی شاگردی نے جوشیلا حنفی بنا دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں جس قدر کتب خانے ہیں ان سب میں مولانا تشریف لے گئے لیکن اسی قسم کی کتابیں تلاش کرتے رہے جو حنفیت کی تائید اور وہابیت کی تردید میں تھیں

وطن آکر جب قلم ہاتھ میں لیا تو غیر مقلدی کی تردید میں خوب زور قابلیت صرف کیا۔ مولانا کا قول تھا کہ انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا جس کا یہ خیال ہو وہ اس گمراہی کے استیصال میں کس قدر قوت صرف کرے گا اور حملہ آوری میں کون سا دقیقہ اٹھا رکھے گا۔

وہابیت کی تردید میں مولانا کے کئی رسالے اردو فارسی اور عربی کے ہیں جن میں ایک عربی رسالہ "اسکات المعتدی" دنیائے مقلدی میں بہت مقبول ہوا۔ روم و شام میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ قسطنطنیہ میں ایک دن مولانا شیخ عبد الفتاح کے یہاں گئے جو ایک بزرگ خالد نقشبندی مرید مرزا مظہر جان جاناں کے بھتیجے تھے وہاں شیخ علی طبیبان ایک مشہور صوفی کے بیٹے بھی آ گئے انہوں نے رسالہ "اسکات المعتدی" اٹھا کر دیکھا جو وہاں رکھا تھا۔ کہنے لگے آہا یہ رسالہ میں نے مدت ہوئی دمشق میں اپنے شیخ کے یہاں دیکھا تھا اور انہوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا کہ "شکر اللہ مساعیہم" اور جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ رسالہ مولانا ہی کی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے مولانا کو اپنی تصنیف کی اس مقبولیت پر نہایت مسرت ہوئی

یہ رسالے بعض خود مولانا کے نام سے چھپے اور بعض دوسروں کے نام سے لیکن مولانا کا اس دلدل میں گرفتاری کا زمانہ جلد ختم ہوگیا۔

مولانا اس زمانہ میں لڑکوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے مولوی حمید الدین صاحب بی اے نے اسی زمانہ میں مولانا سے تعلیم پائی تھی۔ مولانا اس وقت تند مزاج مولوی کے مکمل نمونہ تھے تارکین صلوٰۃ پر انتہائی تشدد کرتے تھے بعض لڑکوں کو دو دو گھنٹہ تک اس لیئے پیٹا کرتے تھے کہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کریں۔

وکالت اور ملازمت

مولانا کی عمر اب اس قابل ہوگئی تھی کہ وہ فکر دنیا میں سر کھپائیں اس لیئے گھر کے لوگوں نے زمینداری کا کاروبار سپرد کیا لیکن شبلی کہاں اور یہ وبال کہاں؟ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ مولانا اس کام کے لیئے وضع نہیں کیئے گئے

اس کے بعد مولانا اردو میں وکالت کا امتحان دے کر وکیل ہوگئے اور چند مہینے تک اعظم گڈھ اور بستی میں وکالت کرتے رہے لیکن اس پیشہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جو داؤ کھیلے جاتے ہیں وہ مولانا کی طبیعت سے کچھ مناسبت نہ رکھتے تھے اس لیئے اس پیشہ کو

بھی خیر باد کہنا پڑا اور امانت میں ملازم ہو گئے یہ زمانہ رمضان کا تھا
لیکن مولانا دیانت دار اور فرض شناس آدمی تھے اس لئے شدید
گرمی میں گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے روزہ
نہیں ہوتا تھا لیکن اپنا فرض مستعدی سے ادا کرتے تھے
نہ افطار کی فکر ہوتی تھی نہ سحری کی ایک مہینہ تک یہ شدائد
برداشت کئے لیکن مولانا کا دل ایک نہایت ہی وسیع میدان
عمل ڈھونڈھتا تھا اس تنگنائے ملازمت میں کب تک گھٹا
کرتے آخر نوکری چھوڑ کر گھر پر کتب بینی درس تدریس اور قصائد
ورسائل کی تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

اس زمانہ میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تصنیف سنین
اسلام چھپ کر شائع ہوئی تھی یہ کتاب مولانا شبلی کے مطالعہ میں
رہتی تھی مسلمانوں کے گذشتہ کارنامے پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے
اس کے ساتھ سید علیہ الرحمۃ کی تعلیمی تحریک اور اصلاح و ترقی
قوم کی منادی سے مولانا کے گوش آشنا ہو چکے تھے اس نے
آنکھوں میں وہ نور پیدا کر دیا جس سے نظر آنے لگا کہ وہ خود اور

اور ان کی ہم مشرب کس تنگ دائرے میں بے کار گردش کر رہی ہیں
یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ مولانا کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم محمڈن
کالج علیگڈہ میں تعلیم پاتے تھے وہاں مولانا بھائی سے ملنے گئے
اس طرح مولانا اس گوشے تک پہنچ گئے جہاں سے "اک صدا ہی جانکاہ"
آرہی تھی جو "دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی" جو "ہمہ تن اثر میں
ڈوبی تھی" جو "نشتر سی جگر میں اتر جاتی تھی" مولانا کی "رگ اثر کو
جنبش ہوئی۔ تو دل تھام کے اُس طرف بڑھے ۔

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکین آیا نظر ایک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورتِ مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

اس "پیر دیرین" کی آواز سے زیادہ نگاہ میں اثر تھا ایک ہی
نظر میں مولانا کو متاعِ دل و دین نذر کر دینے کے سوا چارہ نہ تھا
سید سے زیادہ کون جوہر شناس ہو سکتا تھا۔
مولانا کو ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیا کہ یہ جوہر قابل ذرا سی تربیت میں
شمس العلماء ہو سکتا ہے اس لئے مولانا سے کالج میں رہنے کو

ارشاد فرمایا مولانا پہلے ہی بک چکے تھے بجز سمعنا و اطعنا کے اور کیا کہہ سکتے تھے مرشد کے فرمان کو دل و جان سے قبول کیا اور ایف، اے، اور بی اے کلاس کے پروفیسر عربی فارسی مقرر ہو گئے۔

سر سید علیہ الرحمۃ نے اپنی کوٹھی میں رہنے کو ایک کمرہ مولانا کو دیا۔ کالج میں ایک نیا عالم تھا مولانا حالی مرحوم اور پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ دوسرے اہل علم و فضل موجود تھے عالم اور قابل ۲۴ سالہ نوجوان پروفیسر کی ذات ذہین اور ہونہار طلبا کا مرکز تھی اور گوناگوں علمی صحبتوں اور طلبا کی سوسائٹیوں نے مولانا کے دل و دماغ کو متاثر کر دیا تھا اور وہ وقت آ گیا کہ مولانا اپنے علمی کمالات اور جواہر فطری کو منظر عام پر لائیں سر سید علیہ الرحمۃ صحیح معنی میں مجدد تھے وہ راست بازی مجسم اور قوم کے سچے خیر خواہ تھے یہی جذبہ قومی انھوں نے ہر شخص کے دل میں پیدا کر دیا تھا مولانا کو تو خوش قسمتی سے سر سید کی مربیانہ شفقت اور حوصلہ افزائی کا موقع ہر دم نصیب تھا اس لئے قومی ہمدردی کا جوش غیر محدود دل میں پیدا ہو گیا اور آخر عمر تک مختلف النوع شکلوں میں نمایاں رہا۔

مولانا اپنا فرض (پروفیسری) بڑی دلچسپی اور شوق سے ادا فرماتے تھے اور جن کو مولانا کا فیض تعلیم نصیب ہوا وہ کامیاب طلبا نکلے۔

پروفیسری کے فرض سے جو وقت فرصت ملتا تھا وہ مولانا کتب بینی میں صرف فرماتے تھے سرسید نے اپنے کتب خانے سے استفادہ کی مولانا کو عام اجازت دیدی تھی جہاں مصر و یورپ کی مشرقی مطبوعات خصوصاً تاریخ و جغرافیہ کا نہایت نایاب ذخیرہ تھا مولانا نے یہ کتب خانہ دیکھا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی شوق علم میں کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے کبھی تھک جاتے تھے تو الماری کے پاس زمین پر بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کیا کرتے تھے اس مشغلے کے ساتھ پروفیسر آرنلڈ سے فرنچ پڑھنا شروع کر دیا تھا اور اس قدر پڑھ لی تھی کہ کتابوں سے کچھ استفادہ کر سکتے تھے

تقرر کے چند ہی روز کے بعد طلبا نے پینی ریڈنگ کا جلسہ کیا اس میں مولانا نے اردو میں ایک قومی قصیدہ پڑھا جس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ترغیب اور غیر سے چارہ نوازی کو باعث شرم ظاہر کر کے مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و شوکت اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا دلچسپ نقشہ کھینچا تھا یہ قصیدہ

اس قدر دلچسپ تھا کہ بہت سے طلبا نے اس کی متعدد نقلیں کیں اور سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے تھے۔

اس کے بعد مولانا نے متعدد نظمیں کہیں جن میں مثنوی صبح امید اور سر سید کے قومی تھیٹر کا مسدس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مثنوی صبح امید میں جو ۱۸۸۴ء میں لکھی تھی مسلمانوں کی موجودہ غفلت و جمود سر سید علیہ الرحمۃ کی ترقی قوم کی منادی اور علیگڈھ کالج کی ابتدائی تاریخ کا بیان ہے۔

۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی تو غالباً پہلی مرتبہ مولانا قومی پلیٹ فارم پر آئے لیکن ان کی تقریریں رزولیوشنوں کی تحریک و تائید تک محدود رہیں البتہ دوسرے سال انھوں نے پہلے اجلاس کے ایک رزولیوشن کی تفصیل میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ایک محققانہ تاریخی لیکچر دیا اس کے بعد مولانا نے تاریخ بلاد اسلامیہ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اس کی وسعت کو گھٹا کر تاریخ بنی العباس شروع کی اس وقت یہ کام بھی بہت ہی صبر آزما نظر آیا اس لئے "نامورانِ اسلام" کی ایک اسکیم مرتب کی اور "المامون" لکھ کر شائع کی اس کے بعد مختلف مواقع پر تاریخی لیکچر دیے اور کئی چھوٹے بڑے رسالے لکھے جو اپنے جدید موضوع اور

کثرت معلومات و تاریخی تحقیق کے لحاظ سے بہترین مضامین تسلیم کئے گئے۔
۱۸۹۲ء میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری "سیرۃ النعمان" کے نام سے لکھی۔ یہ دونوں سوانح عمریاں بہت مقبول ہوئیں

روم و مصر و شام کا سفر

مولانا "ناموران اسلام" کے سلسلہ میں "الفاروق" لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جس پیمانہ پر یہ سلسلہ لکھنا چاہتے تھے اس کے لئے ہندوستان میں اس قدر تاریخی سرمایہ نظر نہ آیا جو اس مقصد کے لئے کافی ہو سکے اسی خیال نے مولانا کو روم و مصر کے سفر کی تحریک کی۔
آخر ۲۶ر اپریل ۱۸۹۲ء کو پروفیسر آرنلڈ کے ہمراہ جو انگلستان جارہے تھے مولانا علی گڑھ سے روانہ ہو گئے اور بمبئی سے جہاز مولانا کو منزل مقصود کی طرف لے چلا۔ پروفیسر آرنلڈ نے مولانا سے عربی پڑھنا شروع کر دی تھی جب تک دونوں کا ساتھ رہا جہاز ہی میں سلسلہ تدریس جاری رہا راستہ میں مولانا مسلمانوں کی حالت

بہت غور سے ملاحظہ کرتے جاتے تھے درد قومی اس درجہ تھا کہ جب
اس امت مرحومہ کی اخلاقی و معاشرتی تباہ حالی دیکھتے تھے
تو دل میں رنج و غم کا ایک طوفان امنڈ آتا تھا۔ عدن میں
شمالی قوم کی مبتذل حرکات پر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری
ہو گئے کہ عرب کی اب یہ حالت ہو گئی اور بے اختیار زبان سے
نکلا کہ "قم یا عرب" شہر میں جا کر جب تحقیق ہوا کہ شمالی قوم عرب نہیں ہے
تو کسی قدر تسکین ہوئی۔ سویز پہنچکر ایک خوانچہ والے کو اردو بولتے
دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اردو کی عالمگیری پر تعجب کرتے ہیں۔
بندر سعید میں شہر کی سیر کو نکلتے ہیں تو چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ
مولانا نے سلطنت اسلام کی آبادی دیکھی اس لئے ہر چیز کو
بڑے شوق و استغراق سے دیکھتے ہیں۔ بلند اور شاندار عمارات
دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ الحمد للہ یہاں مسلمان آسودہ حال ہیں
لیکن جب دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی یوروپین سوداگر کا
مکان ہے اور شہر میں ایک بھی عمدہ دوکان یا بلند عمارت کسی مسلمان کی
نہیں ہے تو افسوس کرتے ہیں۔ جاتے وقت بیروت میں تھوڑی
دیر ٹھہرتے ہیں ایک قہوہ خانہ میں بیٹھ کر راہ چلتوں کا تماشا
دیکھتے ہیں جب کوئی شخص شان و شوکت کے ساتھ گاڑی یا

گھوڑے پر سوار سامنے سے گذرتا تو اپنے رہنما سے پوچھتے کہ یہ کون ہے
وہ اکثر یہ جواب دیتا کہ "عیسائی" تو چپ ہو جاتے۔ بمبئی سے بندر سعید
تک کوئی مسلمان جہاز پر نہ تھا یہاں پہنچکر دو ایک مسلمان نظر آئے
اور بیروت میں سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا مولانا خاص
طور پر یہ بات دیکھتے ہیں کہ بدقسمتی سے اول اور دوسری درجہ کو
یہ عزت نصیب نہیں ہوئی لیکن تیسری درجہ میں ہر طرف مسلمان ہی مسلمان تھے
مولانا اس بات کا اثر جہاز ہی پر سے محسوس کرتے تھے کہ اب ہم
اسلامی دنیا میں ہیں۔ لیکن بیروت اور قبرس وغیرہ کی سرسری
سیر سے جو قیاس مولانا نے کیا کہ مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں
اور جسقدر عمدہ دوکانیں اور بلند مکانات نظر آئے وہ کل عیسائیوں
کی تھیں تو ان کا دل روتا تھا غرض اس طرح یہ دردناک مناظر
دیکھتے ہوئے مولانا ۱۳ مئی کو قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ یہاں پورے
تین مہینہ قیام کیا اس مدت میں تمام کتب خانے چھان ڈالے
مدارس کا معائنہ کیا قدیم و جدید تعلیم کا غائر نظر سے مطالعہ کیا
اہل علم و فضل اور خاص خاص عمائدین سے ملے ترکوں علمی حالت
اور اخلاق و عادات کا مشاہدہ کیا غازی عثمان پاشا سے
دو مرتبہ ملاقات ہوئی اور جناب ممدوح ہی کی سفارش پر بارگاہ

سلطانی سے مولانا کو تمغہ مجیدی درجہ چہارم عطا کیا گیا۔ اثنائے قیام
قسطنطنیہ ہی میں ملا محمد آفندی سے جو موصل کے رہنے والے تھے
مولانا نے ترکی پڑھی۔ ملا صاحب بے معاش شخص تھے اور فقر و
فاقہ سے بسر کرتے تھے مولانا نے ان کو دس روپیہ ماہوار پر مقرر
کرنا چاہا۔ لیکن ملا صاحب اس قدر باحمیت اور غیرت مند تھے
کہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا صرف تحقیقات علمی کے لئے
یہاں آئے ہیں تو معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور مفت پڑھاتے رہے
اور اکثر مولانا کی قیام گاہ پر ترکی پڑھا جایا کرتے تھے انہیں سے
مولانا نے ٹوٹی پھوٹی ترکی سیکھ لی تھی لیکن وہ بھی محفوظ نہیں رہی تھی
اس متعلمی کے ساتھ مولانا کو یہاں معلمی کا موقع بھی مل گیا فواد بک
مکتب ملکیہ کے ایک ممتاز طالب علم سے مولانا کے تعلقات
عزیزانہ حد تک پہنچ گئے تھے یہ دمشق کے قریب ایک موضع حصابہ کے
رہنے والے تھے اور دولت مند اور ذی اثر خاندان کے ایک
فرد تھے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل سے تھے
ان کے بھائی سامی بک قسطنطنیہ آئے اور اسی مکان کے
ایک کمرہ میں مقیم ہوئے جس میں مولانا ٹھہرے ہوئے تھے۔
وہ مکتب حقوق میں داخل ہونے کی تیاری کر رہے تھے امتحان میں منتخب ہوا

داخل تھی اس لیئے انھوں نے مولانا سے درخواست کی کہ منطق کے تمام
مسائل پر عبور کرادیں اگرچہ مولانا کا حرج اوقات تھا لیکن سامی بک
کی خاطر سے مولانا نے ان کو اور ان کے ساتھ دو تین اور طالبعلموں کو
ایساغوجی پڑھائی یہ کتاب پڑھ کر جب وہ طالب علم امتحان میں اخلہ میں
شریک ہوے تو سب پاس ہوگئے اس کے بعد فواد بک سے مولانا کی
دوستی اور محبت کا رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا تھا یہ پرلطف واقعہ
خاص طور پر قابل بیان ہے کہ مولانا کبھی کبھی فواد بک کے ساتھ
مغرب کے بعد کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کیا کرتے تھے فواد بک
گانا جانتے تھے اس لیئے مزے میں آکر عربی گیت گایا کرتے تھے
ایک دن مولانا سے بھی فرمائش کی کوئی ہندی چیز سنائیں۔
مولانا کے لیئے یہ بہت نازک موقع تھا یہ ہر فن میں طاق تھے
لیکن عملی موسیقی کی راہوں سے بالکل نابلد تھے اس لیئے مولانا نے
ناواقفیت کا عذر کیا لیکن فواد بک نے اصرار کیا مولانا نے کہا
میں مولوی آدمی ہوں مجھ کو گانے سے کیا واسطہ" لیکن فواد بک
جن ہوکر پیچھے پڑ گئے چار و ناچار مولانا کو اردو کے دو تین شعر آواز
گھٹا بڑھا کر سنانے پڑے اور کہا "ہندی میں یوں ہی گاتے
ہیں" اس وقت کا سین قابل دید ہوگا جب مولانا گنگناتے ہوں

اگانے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں گے

ان دلچسپیوں میں مولانا اپنے وطن کو نہیں بھولے تھے جب کوئی مفید کام دیکھتے تھے تو حسرت کرتے تھے کہ کاش ہمارے ہندوستان میں بھی یہ جاری ہو جائے کالجوں کے معائنہ میں مولانا کو خیال پیدا ہوا تھا کہ جس طرح یہاں طلبا کی وردی، طرز معاشرت، خوراک، ایک ہے اسی طرح مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں جو مختلف سطحیں آج قایم ہیں وہ یک قلم دور کر دی جائیں اور مولانا نے سرسید علیہ الرحمۃ کو وہیں سے ایک خط میں اپنی یہ رائے لکھی تھی، علیگڈھ کالج میں طلبا کا جو مخصوص لباس مقرر کیا گیا ہے یہ مولانا ہی کی تحریک تھی۔

مولانا نے قسطنطنیہ میں رسم سلاملق اور عید کا جلوس بھی دیکھا جس کا بیان مولانا نے بڑے جوش سے کیا ہے اور اپنے دلی جذبات و تاثرات کی خوب تصویر کھینچی ہے۔

قسطنطنیہ سے مولانا بیروت آئے اور کوئی ایک ہفتہ قیام کر کے بیت المقدس تشریف لے گئے وہاں سے مصر میں آئے ان مقامات میں بھی مولانا کے وہی مشاغل رہے جو قسطنطنیہ میں تھے یعنی کتب خانوں اور مدارس کا معائنہ، علما و فضلا سے ملاقات مشہور اور قابل دید مقامات کی سیر اور کتابوں کی تلاش۔

آخر ۲ مہینے کے بعد مولانا مفید تجربات کثیر علمی و تاریخی معلومات ساتھ لے کر ہندوستان واپس تشریف لے آئے واپسی کے بعد مولانا نے بعض بزرگوں اور دوستوں کے اصرار سے سفرنامہ مرتب کیا جو اسی زمانہ میں چھپ کر شائع ہوگیا تھا یہ سفرنامہ اس وقت کی روم و مصر و شام کی علمی و تعلیمی حالت کا بہترین نقشہ ہے

کالج سے قطع تعلق اور حیدرآباد سے تعلق

ممالک اسلامیہ سے سفر کے بعد مولانا مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں پھر فرائض پروفیسری انجام دیتے رہے لیکن چونکہ اس زمانہ میں سرسید علیہ الرحمۃ برائے نام سکریٹری تھے اور سید محمود مرحوم نے کالج پر قبضہ کرلیا تھا جن کے طرز عمل سے ہر شخص شاکی تھا اس لئے کالج سے مولانا کا دل برداشتہ ہوگیا تھا کئی بار استعفٰے دیا لیکن مسٹر بک پرنسپل نے نامنظور کیا آخر مولانا نے چھ مہینے کی رخصت لی سید اور مسٹر بک کا اصرار تھا کہ مولانا یہ چھ مہینے رخصت کے کالج ہی میں گذاریں لیکن مولانا اپنے وطن اعظم گڈھ چلے آئے اسی اثنا میں وہ آفتاب (سرسید) غروب ہوگیا جس کی کشش اپنے کل سیاروں کو وابستہ کئے ہوئے تھی مولانا کی رخصت ختم ہوگئی

تو ۱۶ سال تک اس قومی دار العلوم کی خدمات انجام دینے اور
ایک علمی فضا قائم کرنے کے بعد استعفا دیدیا ترک ملازمت کے بعد
اعظم گڈھ میں مستقل طور پر قیام کا ارادہ کر لیا یہاں الفاروق مرتب
کرتے رہے اور نیشنل اسکول جو ایک انگریزی مدرسہ یہاں قائم تھا
اسکے انتظام میں مصروف ہو گئے لیکن چونکہ ایک عرصہ سے صحت
خراب تھی اس لیئے تبدیلی آب وہوا کے لئے کشمیر چلے گئے وہاں
زیادہ صحت خراب ہو گئی حتی کہ جان کے لالے پڑ گئے آخر وہاں سے
وطن واپس آگئے یہاں حالت مرض ہی میں الفاروق تمام کی
اس وقت بھی مولانا صاحب فراش تھے اور مہینوں تک لکھنا
پڑھنا موقوف رہا خدا خدا کر کے صحت ہوئی الفاروق چھپ کر
شائع ہو چکی تھی۔ مولانا اعظم گڈھ ہی میں تھے کہ حیدر آباد دکن سے
طلبی ہوئی نواب وقار الامرا (مدار المہام سرکار عالی) مولانا کے
علم و فضل کے نہایت معترف تھے انہوں نے مدار المہامی پر سرفراز
ہونے کے بعد ۱۳۰۹ھ میں مولانا کا سو روپیہ ماہانہ بطور منصب علمی
کے مقرر کر دیا تھا اب انہوں نے اصرار کے ساتھ طلب کیا مولانا
تشریف لے گئے تو ہر طبقہ میں نہایت اعزاز کیا گیا وہاں ایک
عظیم الشان جلسہ بھی منعقد کیا گیا جس کے صدر وزیر عدالت تھے

مولانا کا لیکچر ہوا نواب وقار الامراء مولانا سے عزت و احترام کے ساتھ ملے اور قیام حیدر آباد کی فرمائش کی اور بالآخر سر رشتہ علوم وفنون کی نظامت پر مولانا کو مامور کیا مولانا چار سال تک اس عہدہ پر رہے اس عرصہ میں صیغہ علوم وفنون کی اصلاح و درستی اور ترتیب وتنظیم کی اور سلسلہ تصنیف وتالیف بھی جاری رہا علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح عمری، مولانا روم، اور موازنہ دبیر و انیس، اسی زمانہ ملازمت حیدر آباد میں تصنیف فرمائیں۔

مولانا کو یہ ملازمت اگرچہ مذاق کے موافق ملی تھی لیکن دراصل ان کی طبیعت ملازمت کے لیئے موزوں نہ تھی یہ ملازمت اور اس سے قبل علیگڈھ کی ملازمت خانگی مجبوریوں سے کی جس میں جائداد موروثی پر ۲۳ ہزار روپے قرض کا بار تھا ورنہ وہ گوشہ عافیت میں آزادی کے ساتھ علمی و قومی خدمات میں ہمہ تن مشغول رہنا چاہتے تھے حیدر آباد کے دوران ملازمت میں اکثر ہندوؤں کے ایثار نفس کے واقعات پڑھا کرتے تھے اور ہر دفعہ ایک نیا جوش پیدا ہوتا تھا آخر ایک مرتبہ اخبار ہندوستانی کا پرچہ دیکھکر اسقدر متاثر ہوئے کہ فوراً استعفیٰ دیدیا۔

ندوۃ العلما

مولانا پرانی تعلیم (جس سے مراد ہے علوم اسلامیہ کی تعلیم)
کے سخت حامی تھے وہ اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتے تھے اور
دل سے پسند کرتے تھے لیکن ان کے نزدیک مسلمانوں کی قومیت
قائم رہنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری تھی
تاہم جب وہ دیکھتے تھے کہ تعلیم جس طرح سے جاری ہے وہ بالکل
بے سود اور بے معنی ہے تو ان کو نہایت رنج و افسوس ہوتا تھا
روم و شام وغیرہ کے سفر میں جس چیز کا تصور ان کی تمام مسرتوں
اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ یہی قدیم تعلیم کی ابتری تھی مولانا
کا یہی خیال تھا اور ایک حد تک صحیح تھا کہ عربی کی مکمل تعلیم اور انگریزی
کی بقدر ضرورت تعلیم قوم میں اچھے اچھے مصنف و لیکچرار پیدا کر دے گی
جو خالص انگریزی تعلیم نہیں کر سکتی جب مولانا محمد علی صاحب
مرحوم نے ندوۃ العلما کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد علوم اسلامیہ کا
احیا اور قدیم تعلیم کی اصلاح تھا تو سب سے بڑھ کر مولانا شبلی نے
خیر مقدم کیا اور اس کے ساتھ گرویدگی پیدا ہو گئی دوسرے ہی سال
بحیثیت ایک رکن کے شریک ہوئے اور ندوۃ العلما کی ضرورت پر

وقتاً فوقتاً زبردست تقریریں کیں اور اپنی مفید تجاویز جو ہندوستان اور روم و مصر وغیرہ کے مدارس کے تجربات و معلومات کا ماحصل تھیں پیش کیں اور سنہ ۱۸۹۹ء میں ارادہ کرلیا تھا کہ اپنے تجربات و قابلیتوں کو دارالعلوم ندوہ کی ترقی کے لئے وقف کردیں لیکن اس وقت وہاں کی فضا اس قسم کی تھی کہ وہ اپنے ارادہ کو پورا نہ کرسکے زمانے کی ضرورتوں نے علما کو قدیم تعلیم کی اصلاح کی طرف متوجہ کردیا تھا لیکن مجرد یہ خیال کہ موجودہ قدیم تعلیم ناقص و ناکارہ ہے" کافی نہ تھا اس خیال کو عملی جامہ پہنانے اور مکمل صورت میں لانے کے لئے پرانے تعصبات اور تنگ خیالیوں سے آزادی وسعت خیال اور جرارت و ہمت کی ضرورت تھی جو سید علیہ الرحمتہ اور ان کے رفقا کا امتیازی وصف تھا مولانا شبلی نے جس وقت ندوہ کے نصاب تعلیم میں انگریزی داخل کرنے کا سوال پیش کیا تو ایسی زبردست مخالفت ہوئی کہ جس کا وہم گمان بھی نہ تھا اگرچہ یہ تجویز بعد میں منظور ہوئی لیکن اس وقت ندوہ کی عنان اداتہ ایسے بزرگوں کے ہاتھ میں تھی جن کے ساتھ اتفاق رائے سے مولانا جیسے پورے روشن خیال فاضل کا کام کرنا مشکل تھا اور گروہ بندیوں اور نزاعات قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے مجبوراً مولانا کو مستقل طور پر ندوہ میں رہنے کا خیال ملتوی کرنا پڑا علیگڈھ

کالج سے قطع تعلق کے بعد مولانا اگرچہ حیدرآباد میں نظامت صیغہ علوم و فنون پر مامور ہو چکے تھے لیکن ندوہ میں مستقل قیام کا خیال برابر قایم رہا لیکن افسوس ہے کہ علمائے ندوہ کی تنگ نظری اس آرزو کو پورا ہونے میں سدراہ تھی تاہم مولانا ندوہ کی خدمت سے کبھی دست کش نہیں ہوئے۔ مولانا ” اس مجلس سے علیحدہ رکھے گئے جس کے متعلق تیاری نصاب کا کام تھا لیکن صرف شبلی ہی کی ایک ذات تھی جو تنہا اس مہم کو سر کر سکتی تھی اس نے برسوں اس مسئلہ پر غور کیا تھا روم و شام اور مصر میں مدارس عربیہ کا غائر نظر سے معائنہ کیا تھا ان تعلیمی اصلاحات کا بھی مطالعہ کیا تھا جو مصر میں جاری ہو رہی تھیں مصر وغیرہ کی جدید مطبوعات کا کافی ذخیرہ اس کے پاس تھا ایسی حالت میں خود مولانا کا خاموش رہنا اور اپنی مفید معلومات سے محروم رکھنا جرم تھا اگرچہ مجلس نصاب نے اس ضروری عنصر کو علیحدہ رکھا ہو لیکن انہوں نے سعی و ہمت سے کام لیا اور باوجود مخالفتوں کے امرتسر کے جلسہ میں اصلاحی نصاب کے متعلق اصولی مراتب طے کرا لئے اور ایک مکمل خاکہ پیش کر دیا۔ اس عارضی خدمت کے علاوہ انہوں نے زمانہ ملازمت حیدرآباد ہی میں ندوہ کی ایک مستقل خدمت اور کی ان کی دلی خواہش تھی کہ دارالعلوم ندوہ سے

ایک علمی رسالہ شایع کیا جائے تاکہ طلبا میں علمی مذاق و تالیف و تصنیف کا حوصلہ پیدا ہو۔ اور مقاصد ندوہ کی اشاعت ہو چنانچہ انہوں نے کوشش کرکے ایک رسالہ الندوہ کے نام سے شایع کرایا جو عرصے تک مولانا کی نگرانی میں شایع ہوتا رہا اس نے ملک میں قبولیت بھی حاصل کی اور اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوا یعنی مقاصد ندوہ کی اشاعت بھی ہوئی اور طلبا کو مضمون نگار اور مولف و مصنف بنایا اس وقت دارالعلوم ندوہ اس دور میں تھا جسے بقول خود مولانا ڈل ایجز (عہد ظلمت) کہنا چاہئے کیونکہ مولوی محمد علی صاحب اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے خدمات ندوہ سے علیحدہ ہو گئے تھے یہ حالت دیکھ کر مولانا کا دل بے چین تھا آخر مولانا ستمبر ۱۹۰۴ء میں حیدرآباد سے مستعفی ہونے کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ میں آگئے اور بحیثیت معتمد العلوم ندوہ کی عنان ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مولانا کی ندوہ میں آمد مردہ قالب میں جان پڑنا تھا اب مولانا کو موقع ملا کہ ندوہ کو جس معراج ترقی پر پہنچانا ان کا نصب العین تھا اس کے لئے سرگرمی سے کوشش شروع کر دیں چنانچہ معتمدی کا چارج لیتے ہی ندوہ کی اصلاح و ترقی میں ہمہ تن مصروف و مشغول ہو گئے۔

اس وقت ندوہ کا دفتر شاہجہاں پور میں تھا اب وہاں سے
اُٹھ کر لکھنؤ میں آگیا مصارف آمدنی سے بہت زیادہ تھے مولانا نے
گھٹا کر مداخل کے قریب قریب کر دیے نصاب مجوزہ پر اب تک
عمل نہیں کیا گیا تھا وہ جاری کر دیا گیا اور انگریزی بطور لسان
ثانوی کے لازمی کر دی گئی اراکین ندوہ میں بعض کام کے آدمیوں کا
اضافہ کیا ندوہ کی امداد کے لئے جابجا سفر کئے اور وہاں تقریریں
کیں لیکچر دیے ڈیپوٹیشن بھیجے جو کامیاب واپس آئے ریاست
بھوپال سے سالانہ امداد مقرر کرائی جنجیرہ اور بہادل پور سے گرانقدر
رقوم حاصل کیں ہز ہائی نس آغا خاں کو ندوہ کی طرف توجہ دلائی
اور ان کی اخلاقی و مالی امداد حاصل کی طلبا کے لئے اپنا ذاتی
اثر استعمال کر کے دوستوں اور عزیزوں سے وظائف مقرر کرائے
میکڈانلڈ لفٹننٹ گورنر کو ندوہ سے ایک خاص قسم کی بدگمانی
تھی اور وہ اس کی بیخ کنی پر آمادہ تھا جتنے کہ اسکے حامیوں کی
نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی تھی اور وہ مورد عتاب بنے ہوئے تھے
مولانا نے اس حالت کی تبدیلی میں بھی انتہائی کوشش کی اور
اور آخر الامر سر جیمس لاٹوش نے اس خوفناک مطلع کو صاف کر دیا
اس کے بعد سر جان ہیوٹ نے نہ صرف دار العلوم کے لئے

ایک قطعہ اراضی عطا کیا اور تعلیم دنیوی کے لئے ایڈ مقرر کی بلکہ اس اراضی پر دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھا اور اس موقع پر اپنی تقریر میں حوصلہ افزا اور ہمدردانہ خیالات بھی ظاہر کئے۔

مولانا کی ان کارگذاریوں سے وہ عام افسردگی جو ندوہ کی طرف سے ملک میں پیدا ہوگئی تھی دور ہوگئی، اور لوگوں کو ندوہ کی دوبارہ زندگی کا احساس ہونے لگا تعلیم یافتہ اور امرار ورؤسا اور عمائدین قوم نے توجہ مبذول فرمائی اوقاف ملنے کا سلسلہ جاری ہوگیا مدرسہ اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی۔

ندوہ کے کتب خانے پر مولانا نے خاص توجہ کی اپنا کل ذخیرہ کتب جو تمام عمر کا سرمایہ تھا جس میں اکثر بیش بہا کتابیں تھیں ندوے کے لئے وقف کردیا اور دوسرے علم دوست اصحاب سے ان کے کتب خانے ندوے کے لئے حاصل کئے اس طرح ندوہ میں ایک شاندار کتب خانہ قایم ہوگیا۔

شعبہ تعلیم میں مولانا نے جہاں تک ممکن تھا ایسے اساتذہ مقرر کئے جو کسی خاص علم وفن کے ماہر تھے طرز تعلیم میں بھی نہایت مفید تغیر پیدا ہوگیا مولانا خود قرآن مجید صحیح بخاری اور دیگر علوم کا درس دیتے تھے ان تمام واقعات سے تمام ملک میں ندوہ

کی تعلیم کا شہرہ ہوگیا دور دراز مقامات کے طلبا داخل ہونے لگے طلبا کی قابلیت کا جب وہ عربی میں برجستہ تقریریں کرتے تھے تو خاص اثر ہوتا تھا۔

مولانا کی ایک برکت یہ بھی تھی کہ ندوۃ العلما کے سالانہ جلسے بھی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہونے لگے بنارس میں سنہ ۱۹۰۶ء کو ۱۴ اپریل سے ۱۶ اپریل تک جو جلسہ سالانہ منعقد ہوا وہ علمی نمائش کی وجہ سے سالہا سال یادگار رہے گا جس میں کتابوں کے نہایت نادر نسخے، فرامین شاہی اور خطاطی کے اعلیٰ نمونے نہایت کثرت سے فراہم کئے گئے تھے نادر الوجود دواوین کا بیش قیمت ذخیرہ تھا جس سے فارسی نظم کی ترتیب وار تاریخ کا نقشہ برار العین مشاہدہ ہوتا تھا غرضکہ مولانا نے اپنی جدوجہد سعی و کوشش، محنت و سرگرمی سے ندوہ کو زاویۂ جمود و خمول سے نکال کر شاہراہ ترقی پر لگا دیا تھا لیکن بدقسمتی سے قومی تعلیم گاہوں کو ذاتی نمود اور شخصی اعزاز کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا ہے ندوہ میں بھی ایک کارکن گروہ ایسا موجود تھا جس کا اصل مقصد یہی تھا کہ ندوے کو اپنی شہرت و عزت اور اثر و رسوخ کا آلہ بنائیں لیکن چونکہ ان میں علمی قوت مفقود تھی اس لئے ان کو کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ مولانا شبلی نے

جب اپنی جاں کاہیوں سے ندوہ کے جسد بے جان میں روح پھونک دی، اطراف واکناف ہند میں اس کی شہرت پھیل گئی، قوم کو اس طرف توجہ ہوئی تو اس گروہ کے دلوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی اسی زمانے میں مولانا نے اندرونی خرابیوں کی اصلاح کا مطالبہ کیا تو ان حاسدوں کو جن کے سینے میں آتش حسد شعلہ زن تھی اب اپنی اندرونی کاوشوں کے استعمال کا موقع ملا انھوں نے مولانا کی اصلاحی کارروائیوں میں قدم قدم پر روڑے اٹکائے ہر کام میں مخالفت شروع کی اور بالآخر پوری تیاری کے ساتھ ذاتی حملوں پر اتر آئے اور یہ شہرت دی گئی کہ شبلی کی تحریروں تقریروں اور تصنیفات کا طلبا پر برا اثر پڑ رہا ہے وہ اعمال مذہب سے بے پروا ہو رہے ہیں اس شہرت کے ساتھ یہ کوشش بھی شروع کی گئی کہ ایک کمیشن قایم ہو جس میں مولانا بحیثیت ملزم پیش کئے جائیں با اثر حلقوں میں بعض شہرت یافتہ اشخاص نے مشہور کیا کہ شبلی کی نسبت تمام ہندستان میں بد عقیدگی اور الحاد کا شبہہ عام ہو گیا ہے اس لئے اب ان کے انتساب سے ندوہ کو نقصان پہنچ رہا ہے طلبا جو مولانا سے کوئی سبق نہ پڑھتے تھے ان کو حکم دیا گیا کہ وہ شبلی نعمانی سے کچھ نہ پڑھیں۔ ورنہ مدرسہ سے خارج کر دیے جائیں گے۔

ان کارروائیوں سے بددل ہوکر مولانا جولائی ۱۹۱۳ء میں مستعفی ہوگئے اور ان کے استعفے کے ساتھ مولانا عبدالحی سراجہ تصدق رسول اور بعض دیگر اکابر نے بھی استعفا دیدیا جو طلبا اپنے شفیق استاد کے شیدائی تھے ان دلوں کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے ایک زبردست اسٹرائیک کر دی جو تین ماہ تک جاری رہی۔

ارا کین ندوہ کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی موقع کے منتظر تھے یہ علیگڈھ کی ایک مخصوص جماعت تھی جو ندوہ کی ترقی کو باوجود سرسید علیہ الرحمۃ سید محمود مرحوم نواب محسن الملک مرحوم اور نواب وقارالملک مرحوم کی تائید کے رقیبانہ نظروں سے دیکھتی تھی ایک غضب یہ ہوگیا کہ اس زمانہ انتشار و ہیجان میں سیاسیات اور یونیورسٹی کے بعض مسائل کے متعلق مولانا نے جو نظم و نثر میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے اور بعض نظموں میں دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑ دیا تھا جس نے اس جماعت کو تلملا دیا اس لئے یہ بھی اس موقع پر حمایت ندوہ یا مولانا کے مخالف منتظمین کی تائید کے پردہ میں مولانا کے خلاف حرکت میں آئی لیکن ملک تمام حالات سے واقف ہوچکا تھا دہلی میں ایک

عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں نواب وقار الملک نواب اسحق خاں مولانا محمد علی نواب صدر یار جنگ اور دیگر اکابر شریک ہوئے اور منتظمین ندوہ کو نظام ندوہ میں تبدیلی پر مجبور کیا اور جدید دستور العمل تیار ہو گیا۔

دیگر قومی، سیاسی، اور مذہبی خدمات

جب سے مولانا علیگڈھ کالج کی فضا میں پہنچے اور سید علیہ الرحمۃ کے فیض تربیت سے مستفیض ہوئے اسی وقت سے مولانا قوم کے سچے ہمدرد و جان نثار بن چکے تھے بلکہ قومی خدمات کے لئے ان کی زندگی وقف ہو چکی تھی جب سے آخر عمر تک مولانا کے کام اور خدمات بدلتے رہے لیکن قومی ہمدردی کے مرکز سے بال برابر بھی نہیں ہٹے اور ان کی تمام خدمات کا محور بجز قوم کے دوسرا نہ تھا۔ زمانہ پروفیسری کالج میں جو وقت فرصت ملتا تھا وہ دیگر قومی خدمات میں صرف فرماتے تھے۔ ترک ملازمت کے بعد بھی مولانا کے کالج سے ہر قسم کے تعلقات علمی و اخلاقی قائم رہے زمانہ ملازمت حیدرآباد میں جب ان کو استعفیٰ دینے کا خیال پیدا ہوا تو اس وقت ان کا یہی ارادہ تھا کہ مستقل طور پر یا تو علیگڈھ

کالج میں رہیں گے یا ندوہ میں لیکن اس آخر الذکر تعلیم گاہ کی حالت بے حد انحطاط پذیر تھی اور یہاں کوئی اس بارگراں کا سنبھالنے والا نہ تھا اس لئے ضرورت کا اقتضا یہی تھا کہ وہ بجائے کالج کے ندوہ کو اپنا مستقر بنائیں۔ کانفرنس میں ابتدا رقیام سے شریک ہوئے اور علاوہ ریز ولیوشنوں کی تائید واختلاف کے نہایت قیمتی لیکچر دیے اور رسالے لکھکر پیش کئے جو مولانا کی قابل قدر قومی خدمات میں شامل ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم الجزیہ، حقوق الذمیین، اور کتب خانہ اسکندریہ زمانہ ملازمت کالج ہی میں مولانا نے کانفرنس کے لئے لکھے تھے۔ ترک ملازمت کالج کے بعد بھی کانفرنس میں مولانا کی تقریروں اور لیکچروں کا سلسلہ جاری رہا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں مولانا کانفرنس کے شعبہ ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے یہ کام مولانا کی دلچسپی کا تھا اس لئے انہوں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کیا اور جب تک مولانا سکریٹری رہے اس شعبہ میں بہت کام ہوا اور چند نہایت عمدہ کتابیں شائع ہوئیں لیکن دو سال کے بعد کچھ ندوہ کی مصروفیتوں اور کچھ کانفرنس کی عدم دلچسپی اور مالی تنگدستیوں کے باعث مستعفی ہو گئے

سنہ ۱۹۱۱ء میں صوبہ متحدہ کے چیف سکریٹری مسٹر برن نے ایک ورنیکلر اسکیم پیش کی تھی جو اردو کے حق میں سم قاتل تھی اس میں ایک یہ بھی تجویز تھی کہ رائج بھاشا انٹرینس کے امتحانات میں لازمی کر دی جائے اور اردو جو مدارس میں جاری ہے وہ اس طرح کر دی جائے کہ ہندی بن جائے اس اسکیم پر غور کرنے کو ایک کمیٹی قایم کی گئی جس میں نہایت قابل ہندو اور بعض مسلمان گرایجوٹ ممبر بھی تھے مولانا بھی اس کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے تھے کمیٹی کے متعدد اجلاس ہوئے جس میں مولانا شریک ہوئے اور بہ زور بحثیں کیں مولانا نے ایک یادداشت بھی لکھی وہ ایسی مدلل تھی کہ انگریز اور ہندو ممبروں کو بھی اس سے اتفاق کرنا پڑا اور مولانا کی کوشش سے اردو ناگری کی حالت میں آنے سے بچ گئی۔

الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا ایک عرصہ تک جب طلبا آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ "فارسی" یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک "مضمون" ہونے کے ناقابل سمجھی گئی لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت

ایک کورس تیار کیا جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ " فارسی" کا وقار قایم رہ گیا اور اس کا اخراج ملتوی ہوگیا لیکن برادران وطن نے جو کوششیں اردو کے مٹانے کے لئے کی تھیں ان کو دیکھتے ہوئے فارسی کے متعلق بھی خوف پیدا ہوگیا تھا اس لئے کانفرنس منعقدہ کلکتہ سنہ ۱۹۱۱ع میں یہ رزولیوشن پیش کیا گیا کہ " بی، اے کی ڈگری کے لئے فارسی بطور اختیاری مضمون کے قایم رہنا پسندیدہ امر ہے اور یہ کہ نصاب تعلیم جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے اس میں اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے" مولانا نے اس رزولیوشن کی تائید میں ایک نہایت مدلل اور زبردست تقریر کی جس میں انہوں نے مخالفین کا یہ اعتراض کہ " فارسی کلاسیکل زبان نہیں ہے اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو تربیت دینے کی قابلیت نہیں ہے اس کے لٹریچر میں علوم و فنون اور حقیقی شاعری نہیں ہے اور اس کے لٹریچر کا رتبہ بالکل ادنیٰ ہے" زبردست دلائل و براہین سے باطل کیا انہوں نے دکھایا کہ علم کی تمام شاخیں جو عربی میں ہیں وہ فارسی میں بھی موجود ہیں فلسفہ اور منطق کی مکمل تصانیف ہیں علم طب بھی ہے اور مسلمانوں کی عہد زرین کی تاریخ کی تنہا سرمایہ دار ہے پھر انہوں نے بادشاہوں کی

اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریوں اور ان کے روزنامچوں کی فوقیت کو جو تمام زبانوں کے مقابلہ میں ہے بیان کر کے فارسی نظم کے فلسفیانہ مضامین پر بحث کی غرض مولانا نے پوری طرح ثابت کر دیا کہ فارسی زبان ایک کلاسیکل زبان ہے۔

۱۹۱۱ء میں جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں بھی مولانا نے سرگرمی سے حصہ لیا پنجاب کے مشہور ڈیپوٹیشن میں شریک ہو کر سفر کیا اور لاہور کے عظیم الشان جلسہ میں وہ دلچسپ اور موثر فارسی نظم پڑھی جس کا یہ شعر آج تک زبانوں پر ہے

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد
کہ این سررشتہ تعلیم با در دست ما باشد

مولانا کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور اپنے قابل قدر مفید مشوروں سے مدد بھی دیتے رہتے تھے۔

مولانا کی تعلیمی کوششوں میں اعظم گڈھ کا اسکول خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جب مولانا کو وکالت شروع کرنے کے ساتھ انگریزی کی ضرورت و اہمیت معلوم ہوئی تو انھوں نے ۱۸۸۳ء میں چندہ سے اپنے وطن و اعزہ کے بچوں کے لئے انگریزی تعلیم کا ایک مدرسہ اعظم گڈھ میں نیشنل اسکول کے نام سے اپنے مکان میں قائم کیا۔ علیگڈھ کی

ملازمت اور مصروفیت کے باوجود اس کی ترقی میں ساعی رہتے تھے
یونیورسٹی سے ملحق کرا کے گورنمنٹ اور بورڈ سے امداد بہم حاصل کیں
اس کی عمارت تیار کرائی اور بہت زیادہ روپیہ اپنے پاس سے دیا
مولانا اپنے عزیزوں سے چندہ کے علاوہ ان کو مدرسہ کی امداد
و ترقی کے لئے بھی متوجہ کرتے رہتے تھے۔ جب آمدنی میں کمی ہوتی
تھی تو علاوہ معینہ چندہ کے کمی پوری کرتے اگر کچھ قرض ہو جاتا تو
اپنے پاس سے ادا کر دیتے مدرسہ کی تعلیمی ترقی پر خاص طور سے
نظر رکھتے تھے اور خود جانچ کرتے رہتے تھے اعظم گڈھ سے
باہر کے قیام میں برابر اس کی رپورٹیں دیکھتے رہتے تھے اور
مناسب ہدایتیں بھیجتے تھے اور جب اعظم گڈھ میں قیام رہتا تو
ذاتی طور پر نگرانی کرتے تھے۔ اگر اعزا چندہ میں پہلو تہی کرتے تھے
تو ان سے ناراض ہو جاتے تھے اور اپنا ملال صاف صاف ظاہر
کر دیتے تھے۔

مسلمانوں کی قومی یا سیاسی خدمات میں سب سے بڑا
کارنامہ مولانا کا قانون وقف علی الاولاد بھی ہے۔ سید علیہ الرحمۃ نے
ممبری کونسل کے زمانہ میں "وقف خاندانی" کے نام سے ایک مسودہ
قانون تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی سے بچانا مقصود تھا

سید علیہ الرحمۃ نے سنی اور شیعہ کی فقہی کتابوں سے ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص اپنی جائداد اس طرح وقف کرسکتا ہے کہ جائداد قایم رہے اور نفع نسلاً بعد نسل اولاد کو ملتا رہے۔ یہ مسودہ مرتب کرنے کے بعد تہذیب الاخلاق اور دیگر اخبارات میں شائع کیا علما کے فتوے بھی حاصل کیے لیکن سید علیہ الرحمۃ کے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ چونکہ ولایت کے مقننوں میں یہ مسئلہ طے ہو گیا ہے کہ کوئی جائداد ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال نہیں بنائی جاسکتی اس لئے یہ مسودہ کونسل میں پیش کرنا عبث ہے اس لئے سید علیہ الرحمۃ دست بردار ہو گئے تھے۔ مولانا شبلی نے اسی مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا سب سے پہلے انہوں نے ایک رسالہ لکھا جس میں پریوی کونسل کے فیصلوں کی نہایت سنجیدہ دلائل سے تردید کی جن کی بنا پر وقف علی الاولاد ناجائز قرار پایا تھا اور حدیث و فقہ سے ثابت کیا کہ جائداد ناقابل انتقال طور پر وقف ہوسکتی ہے پھر مولانا نے ایک لوکل کمیٹی قائم کی مختلف مقامات پر دورے کئے اخبارات میں مضامین اشتہارات اور اپیلیں شائع کیں علما اور اکابر ملت کو متفق الرائے بنایا اور کئی سال تک سرگرم کوششوں اور سخت جدوجہد کے بعد میموریل تیار کرایا اور

مسٹر مظہر الحق مسٹر محمد علی جناح اور دیگر مسلمان متقدمین اور ڈاکٹر تیج بہادر سپرو سے تبادلہ خیالات کیا کلکتہ جا کر تمام مراتب اعلیٰ حکام کے گوش گذار کئے ممبران کونسل سے گفتگوئیں کیں پبلک جلسوں میں اس کی ضرورت و اہمیت پر تقریریں کیں ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک ایکٹ شایع کر دیا گیا مسلمانان ہند میں مولانا کی یہ خدمت ہمیشہ احسان مندی کے ساتھ یاد رکھی جاے گی۔

اغلاط تاریخی کے متعلق ایک کوشش اور قابل تذکرہ ہے نصاب تعلیم کی تاریخوں میں بالعموم اور انگریزی کتابوں میں بالخصوص مسلمانوں کے تذکروں میں جس قدر تاریخی غلطیاں ہیں ان کو ہر مسلمان جو کچھ بھی اسلامی تاریخ سے واقف ہے بہ یک نظر معلوم کر لیتا ہے۔ لیکن ان غلطیوں میں جو تعصب اور دل آزاری ہے اُس کو تو ہر شخص محسوس کرتا ہے مولانا نے ندوہ کے ذریعہ کوشش کی کہ ان تمام اغلاط تاریخی کی ایک یادداشت تیار کی جاے اور گورنمنٹ کو توجہ دلائی جاے اس سلسلہ میں مارسڈن کی تاریخ ہند سخت دل آزار تھی مولانا نے اس تاریخ کے متعلق رجسٹرار کو ایک پرزور یادداشت بھیجی اور نتیجے میں مارسڈن مجبور ہوا کہ اس کی اصلاح کرے مولانا فرماتے تھے کہ جب مارسڈن ان سے ملنے آئے

اور اس مبحث پر گفتگو ہوئی تو دوران گفتگو میں مارسڈن نے کہا کہ ان غلطیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلامی حصہ ان لوگوں کا لکھا ہوا ہے جو اسلامی تاریخ سے واقف نہ تھے اور مسلمانوں میں ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو یہ حصہ لکھ دیتا۔

مولانا کی سیاسی حیثیت سے کچھ شہرت نہیں ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ مولانا کو سیاسیات سے بیحد دلچسپی تھی اور وہ نقلی و اصلی پالٹیکس کا فرق خوب سمجھتے تھے خیالات کے لحاظ سے وہ پورے کانگرسی تھے اور مسلمانوں میں گروہ احرار کے ایک ممتاز فرد تھے اور اگرچہ وہ سیاسی پلیٹ فارم پر کبھی نہیں آئے۔ اور نہ اُنھوں نے نیشنل کانگرس یا مسلم لیگ میں کوئی عملی حصہ لیا لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی سیاسیات کا رخ بدلنے میں ایک زبردست ہاتھ مولانا کا بھی تھا زمانے کی ضروریات نے مجبور کیا کہ مسلمان بھی پالٹیکس کے میدان میں گامزن ہوں لیکن اس سے قبل جس تربیت گاہ میں انھوں نے پرورش پائی تھی اس میں بجز وفاداری اور خیر خواہی کے دوسری کوئی آواز ہی نہیں سنی تھی اور اس پالیسی کے خلاف کوئی اور پالیسی اُن کے دائرۂ وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی تاہم سالہا سال کے نقش آسانی سے نہیں مٹ سکتے تھے مسلمانوں نے

لیگ قائم کی تو قدیم پالیسی کے گہرے اثرات ان کی ہر بات میں نمایاں تھے جو مقاصد قائم کئے گئے تھے ان کا دائرہ نہایت محدود تھا مولانا جنہوں نے گہری نظر سے سیاسی مسائل کا مطالعہ کیا تھا یہ حالت دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور ایک زبردست اور معرکۃ الآرا مضمون "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے عنوان سے لکھا جو مرحوم مسلم گزٹ کے تین چار نمبروں میں شائع ہوا اس مضمون نے اور سب سے زیادہ مولانا کی نظموں نے مسلمانوں کی سیاسیات پر بہت اثر کیا جن میں وفاداری کے بت اور مسلمانوں کی سیاسی بے راہ روی پر ایسی خوبصورتی سے حملے کئے گئے ہیں کہ زخمی دلوں کا اپریشن ہو گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔

مولانا کی مذہبی خدمات میں قطع نظر ان کی بعض تصانیف کے قابل بیان یہ واقعہ ہے کہ زمانہ پروفیسری کالج میں مولانا کبھی کبھی اسلام پر لیکچر بھی دیتے تھے جس سے طبائع میں قوت ایمانی مضبوط ہوتی تھی اور محاسن اسلام کے نقوش دلوں پر مرتسم ہوتے تھے انہیں لیکچروں کا اثر تھا کہ اس زمانہ میں ایک نئی مذہبی زندگی کالج میں پیدا ہو گئی تھی طلبا نے ایک مجلس "لجنۃ الصلوٰۃ" کے نام سے قائم کی تھی جسکے بہت سے تعلیم یافتہ ممبر تھے چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان

انگریزی خواں لوگوں کو الصلوٰۃ خیر من النوم کے پُر اثر فقرہ سے چونکا دیتا تھا ، پانچوں وقت کی نماز با جماعت ہوتی تھی۔ نماز مغرب کی شان و شوکت سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ سید علیہ الرحمۃ خود شریک ہوتے تھے اور چونکہ وہ متبع سنت تھے ان کی آمین کی گونج روح افزا ہوتی تھی اسی زمانے میں مولانا نے طلبا کے لئے عربی میں سیرت نبوی کا ایک رسالہ " بدر الاسلام " لکھا تھا جو اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں وہ تمام ضروری واقعات جو کم از کم ایک مسلمان کو معلوم ہونے چاہئیں ادبی ذوق کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں۔

مولانا نے خطرہ ارتداد کی طرف بھی قوم اور علمار قوم کو توجہ دلائی باوجود خرابی صحت کے جگہ جگہ دورے کئے ایسی آبادیوں کے نقشے بنوائے جہاں نومسلم خاندان آباد تھے ان کے حالات کی تحقیقات کرائی جن سے معلوم ہوا کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں آریوں کی مقامی کمیٹیاں جا بجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں اور راجپوت خاندان مرتد ہو رہے ہیں اور آریوں کی کمیٹیاں سرگرمی سے کام کر رہی ہیں یہ حالات معلوم کر کے مولانا نے اشاعت اسلام کا صیغہ قائم کیا اپیل شائع کئے اور ایسے معلمین کے لئے جو دیہات میں جا کر اردو کی ابتدائی کتابیں اور قرآن شریف پڑھا سکیں انتظام کیا لیکن جب

دیہات میں تلقین کرنے والے واعظوں کی فراہمی سے مایوسی ہوئی تو طلبا ندوہ میں سے خادم الدین کی ایک جماعت قایم کی جس میں چند طالب علم اس عہد و پیمان کے ساتھ داخل ہوے کہ وہ اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں گے لیکن افسوس ہے کہ ندوہ کے منتظمین نے ان تجاویز کے آغاز ہی میں وہ طریق عمل اختیار کیا کہ مولانا کو کامیابی نہ ہو سکی تاہم مولانا کا ارادہ تھا کہ اعظم گڈھ میں ایسا ادارہ قایم کریں اور مسلمانوں کا ایک گروکل بنا دیں لیکن افسوس کہ موت نے یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔

مولانا کی سب سے بڑی خدمت جو مذہبی و قومی حیثیت رکھتی ہے دار المصنفین ہے مولانا کا ایک عرصہ سے خیال تھا کہ قابل نوجوانوں کی تربیت کا بندوبست کیا جائے الندوہ کے اجرا کی ایک غرض یہ بھی تھی ان کے طریقۂ درس میں بھی یہی مقصد پیش نظر رہتا تھا معتمدی ندوہ کے زمانہ ہی میں انہوں نے ایک خاکہ تیار کر لیا تھا ندوہ سے علیحدگی کے بعد فوراً ۱۹۱۳ء میں اعظم گڈھ میں دار المصنفین کی بنیاد قائم کر دی اپنا باغ اور بنگلہ وقف کر دیا باغ کی اراضی میں اور اعزا بھی شریک تھے ان کو بھی وقف کے لئے راضی کیا اپنا کتب خانہ جو دار العلوم ندوہ سے

بچ رہا تھا اور پھر جس میں کافی ذخیرہ کتابوں کا جمع ہو گیا تھا دار المصنفین کے لئے وقف کر دیا اور اعزا و احباب سے بھی اس کتب خانہ کی ترقی میں امداد لی۔

سب خدمات سے بالاتر مولانا کی یہ خدمت ہے کہ وہ اپنے جانشین بنا گئے یہ ایسا امتیاز ہے کہ ان کے اقران و اماثل میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔

مولانا نے ایک خاتون کی بھی تربیت کرنا چاہا تھا اور ان کی تمنا تھی کہ یہ خاتون بہت بڑی مقررہ اور لیکچرار ہو جائے لیکن مولانا کی نظر محبت نے غور سے مطالعہ نہ کرنے دیا ورنہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ جس منصۂ کمال پر وہ لانا چاہتے ہیں اس کے خلاف میلان طبیعت دوسرے اسٹیج کی طرف ہے۔

جاں کشاید سوے بالا بالہا   در زدہ تن در زمیں چنگالہا

تصنیفات و تالیفات

مولانا کو تصنیف و تالیف کا شوق پہلے ہی سے تھا لیکن جب تک مولویت کا غلبہ رہا مولانا وہابیت اور حنفیت کے دائرہ سے آگے نہ بڑھ سکے جب علیگڈھ کالج میں آئے تو پہلا اُستاد نے

قومی ہمدردی کا سبق پڑھایا اور اس فضا میں "قومی تعلیم" "قومی ترقی" "قومی فلاح" "قومی ہمدردی" اور قومی خیرخواہی "قومی خدمت" کے سوا اور کوئی آواز ہی کان میں نہیں آتی تھی اس لئے مولانا نے بھی اپنے قلم کی شاہ راہ "قومی تاریخ" انتخاب کی سب سے پہلے کانفرانس کے لئے چند رسالے لکھے جو اس انجمن کے بہترین کارناموں میں شمار کئے جاتے ہیں ان کے بعد اور کئی رسالے لکھے ان ابتدائی گیارہ رسالوں کا مجموعہ "رسائل شبلی" کے نام سے چھپ کر شائع ہوا۔ ان میں بجز دو رسالوں کے جن میں ایک مصری فاضل کے سفرنامہ پر تبصرہ ہے دوسرا ندوۃ العلماء پر لکچر اور تمام رسالے مسلمانوں کی گذشتہ ترقی یافتہ تمدن کے مختلف اجزا کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔

مولانا کی تصانیف کا اہم موضوع دو اجزا سے مرکب تھا ایک سلف کے کارنامے، دوسرے غیر مسلم مصنفین کے تاریخ اسلام کے متعلق اغلاط و اعتراضات کا اندفاع۔ ان رسائل میں بھی یہی موضوع نمایاں ہے۔ کتب خانہ اسکندریہ نہایت معرکۃ الآرا رسالہ ہے اس میں نہایت زبردست دلائل اور ناقابل انکار براہین سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ عہد فاروقی میں نہیں بلکہ اس سے پہلے ہی عیسائیوں کی "علم دوستی" برباد کر چکی تھی۔

مستقل کتابوں میں سب سے پہلے المامون تصنیف کرکے شائع کی اس کا شائع ہونا تھا کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی اور ایک سال کے بعد دوسرا اڈیشن شائع ہوا اس کتاب پر سرسید علیہ الرحمۃ نے دیباچہ لکھا تھا۔ دوسری کتاب سیرۃ النعمان مرتب کی یہ بھی بہت مقبول ہوئی تیسری کتاب جس کو خود مولانا اپنی تصانیف میں بہترین تصنیف سمجھتے ہیں الفاروق ہے جو روم و مصر و شام کے کتب خانوں کی چھان بین کا نتیجہ ہے یہ کتاب بھی بے حد مقبول ہوئی اور اب تک نظر قبولیت دیکھی جاتی ہے مولانا کی بحیثیت بلند پایہ مورخ و مصنف کے شہرت کی بنیاد اسی کتاب نے رکھی۔

الفاروق کے ایک عرصہ بعد مولانا نے علم الکلام لکھی جس میں مسلمانوں کے علم کلام کی ابتدا اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ہے مولانا کا ارادہ تھا کہ تمام مسلمان اساطین علم کلام کی مبسوط سوانح عمریاں مرتب کی جائیں پھر موجودہ ضرورت کے لحاظ سے جدید علم کلام پر ایک جامع کتاب لکھی جائے لیکن دوسرے ضروری امور نے اس سلسلہ کو پورا ہونے دیا علم کلام کے بعد مولانا نے الغزالی لکھی جس کا اس سال کی سرکاری رپورٹ میں بہت تعریف کے ساتھ تذکرہ کیا گیا پھر الکلام لکھی جو علم کلام پر تھی

اس کے بعد سوانح عمری مولانا روم شائع کی جو اس لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے کہ اس میں مثنوی کے علم کلام کے اہم مسائل جمع کئے گئے ہیں اس حیثیت سے کسی نے مثنوی کو نہیں دیکھا تھا۔ سوانح مولانا روم کے بعد لکھنو کے ایک صاحب کی فرمائش سے مولانا نے "موازنہ انیس و دبیر" ایک کتاب لکھی مولانا شعر کے بہت بڑے نقاد تھے، چنانچہ اس کتاب سے مولانا کی سخن فہمی علم معانی و بیان پر کامل عبور اور نقد شعر میں رفعت مرتبہ کا پورا ثبوت ہوتا ہے۔

اساتذہ فارسی کے دیوان مولانا نے کثرت سے مطالعہ کئے تھے اور شاعری کا نہایت صحیح مذاق رکھتے تھے فارسی شاعری کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقیوں اور تغیرات پر وسیع نظر رکھتے تھے اس لئے ان ذخائر کو جو سینے میں تھے سفینہ میں لانے کا خیال پیدا ہوا اور مولانا نے شعر العجم تصنیف کی جو پانچ مبسوط جلدوں میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے ان میں فارسی شاعری کی ابتدا تدریجی ترقی اور عہد بعہد کے تغیرات کے علاوہ ان تمام اساتذہ فارسی کے کلام پر تفصیلی تبصرہ ہے جو کسی طرز جدید کے موجد تھے یہ تصنیف پنجاب یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہے اور اس پایہ کی ہے کہ مشہور

مستشرق براؤن نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔

اسلاف پر اعتراض کی مولانا کو برداشت نہیں ہوتی تھی کم پایہ مصنفین کی باتوں پر تو مولانا خیال بھی نہیں کرتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ معمولی لوگوں کی ہفوات پر اعتنا کرنا یا ان کے جواب دینا مولانا کی شان کے قطعی خلاف تھا لیکن جب کسی مشہور مصنف کی زبان قلم سے کوئی اعتراض سنتے تھے تو پھر مولانا کو تاب نہیں رہتی تھی مصر کے مشہور عیسائی فاضل نے تمدن اسلام پر کئی جلدوں میں ایک کتاب لکھی جس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا ہے اس کتاب میں خوشنما الفاظ کے ساتھ انتہائی تعصب مخفی تھا اور اس نے شاہان اسلام پر درپردہ سخت حملے کئے تھے مصر کے اہل علم کو اس کے جواب کی ہمت نہیں ہوئی لیکن مولانا نے الانتقاد کے نام سے عربی میں ایک رسالہ لکھا جس میں جرجی زیدان کی تاریخی غلط بیانیوں کی خوب پردہ دری کی ہے اور اس کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا جب یہ رسالہ مصر میں پہنچا تو وہاں کے علما نے بہت پسند کیا اپنی احسان مندی ظاہر کی اور خوش ہوئے کہ ایک بڑا اہم کام انجام پا گیا۔ اسی طرح عالمگیر پر مولانا نے الندوہ میں ایک معرکۃ الآرا سلسلہ مضامین لکھا جس کا مجموعہ مضامین

عالمگیر" کے نام سے علیحدہ شائع ہوگیا ہے۔ سب سے آخری تصنیف
مولانا کی سیرۃ النبی ہے سنہ ۱۹۱۲ء میں مولانا نے اس مہتم بالشان تصنیف
کا ارادہ کیا تھا۔ اور ایک اسکیم بھی لکھ کر شائع کی تھی جس میں پچاس
ہزار روپے کی ضرورت ظاہر کی۔ دربار بھوپال سے فوراً امداد
منظور ہوئی اور مولانا ہمہ تن سیرت کی تالیف و تصنیف میں مصروف
ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ
پیام اجل آگیا قطع نظر سیرت کے اس کا مقدمہ اردو کی لازوال چیزوں میں ہے
اس مختصر رسالے میں ہم مولانا کی تصانیف پر تفصیلی ریویو
نہیں کر سکتے تاہم اس قدر ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ عام مصنفین
کے خلاف جو چند کتابوں سے موٹے موٹے واقعات لے کر ایک
تاریخ یا سوانح عمری مرتب کر دیا کرتے ہیں مولانا تمام ذخیرہ کتب
جو دسترس میں ہوتا تھا نہایت غور و احتیاط سے مطالعہ کرتے تھے
اور اکثر جزئیات ایسی کتابوں سے اور کتاب کے ایسے گنجلک
مقامات سے تلاش کر لیتے تھے جن پر کسی کی نظر نہیں پڑتی تھی پھر ان
جزئیات کو ایسی خوبصورتی سے ترتیب دیتے تھے کہ جس سے
بہتر ترتیب نہیں ہو سکتی اسکے ساتھ مولانا جو کچھ لکھتے تھے وہ
نہایت حزم و احتیاط سے اور انتہائی تحقیق و تنقید اور اصول فلسفہ

تاریخ کے مطابق۔ اگر تاریخی واقعات کے بیان میں کہیں کہیں مولانا سے بے احتیاطی ہو گئی ہے تو اس میں ہر مصنف معذور ہے مصنف و مولف کے علاوہ مولانا بہت بڑے مضمون نگار بھی تھے۔ اُن کے بہ کثرت مضامین تہذیب اخلاق، رسالہ حسن، علیگڈھ منتھلی، الندوہ اور بعض دوسرے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے "مقالات شبلی" کے نام سے ایک مجموعہ مضامین شائع ہو چکا ہے لیکن ابھی بہت مضامین باقی ہیں۔ اگر جمع کئے جائیں تو "مقالات شبلی" سے زیادہ ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

مضمون میں جو خوبیاں ہونا چاہئیں وہ مولانا کے سب مضامین میں موجود ہیں مناسب و موزون تمہید حشو و زوائد سے پاک تمام ضروری و کارآمد پہلوؤں پر حاوی اور نتیجہ قابل تعریف اگر کوئی مضمون نگاری سیکھنا چاہئے تو مولانا کے مضامین کا مطالعہ اُس کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے۔

بہ لحاظ زبان و طرز بیان مولانا کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہو سکتا ہے۔ جب مولانا انشا پردازی کے میدان میں آئے تو سید علیہ الرحمۃ کی سادہ، سلجھی ہوئی اور پر اثر اردو اور مولانا حالی مرحوم کی شستہ و رفتہ سلیس و برجستہ عبارت ا

مولانا نذیر احمد مرحوم کی کثیر اللغت اور بامحاورہ زبان مولانا آزاد کی دل آویز اوبیت اُن کے پیش نظر تھی، انہیں بزرگوں کی انشا پردازیوں سے مولانا نے اپنی انشا پردازی کو ترکیب دیا اور چونکہ مولانا ذہین و طباع اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے اس لئے اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے اپنی طرز انشا پردازی کا ایک خاص رنگ پیدا کر لیا۔ وہ نہایت صحیح و فصیح اردو لکھتے ہیں اور اُن کی عبارت میں وہ شان سنجیدگی و متانت موجود ہے جو ایک فاضل کی عبارت میں ہونا چاہیئے۔ مولانا ہر مطلب کو اس کی موزوں و مناسب الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اظہار خیال میں کوئی اغلاق و پیچیدگی نہیں ہوتی اور طرز انشا (اسٹائل) دلنشین ہوتی ہے

شاعری

مولانا شبلی کی طرح جامع کمالات بہت کم لوگ پیدا ہوتے ہیں مولانا جس طرح ایک زبردست اہل قلم تھے اُسی طرح بہت اچھے لیکچرار بھی تھے مولانا کے عالمانہ لیکچروں میں لوگوں کے لئے خاص کشش ہوتی تھی اور بعض بعض لیکچر مولانا نے بڑے معرکے کے دیئے ہیں

شاعری میں ان کی دو روشیں ہیں ایک عام اور ایک خاص خاص میں ان کا انداز بالکل نرالا اور انوکھا ہے وہ شعر و سخن میں کسی کے شاگرد نہ تھے اعظم گڈھ کے مشاعروں نے شوق دلایا لیکن انھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ کبھی نہیں بنایا ان کا اصول شعر گوئی بالکل فطرت کے مطابق تھا جس کا ہر شاعر کو لحاظ رکھنا چاہئے یعنی بغیر طبیعت کی حاضری اور کسی واقعہ یا منظر کے اثر سے بلا متاثر ہوئے شعر نہ کہنا چاہئے مولانا خود لکھتے ہیں کہ۔

"میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں ہوں یعنی بغیر کسی خاص فوری اثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا"

مولانا کی ابتدائی اردو غزلوں میں تکلف و تصنع کی جھلک نظر آتی ہے البتہ فارسی شاعری سے کامل مناسبت تھی اور تھوڑے عرصہ میں انھوں نے وہ کمال حاصل کرلیا تھا کہ اہل زبان کا دھوکا ہوتا تھا۔

سنہ ۱۸۸۴ء میں علی حزیں کی ایک غزل پر غزل لکھی اور دونوں غزلیں مقطع نکال کر خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف قیصر نامہ اور نیر دہلوی کے پاس محاکمہ کی غرض سے بھیجی گئیں دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے اور سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے

آخر میں تو وہ فارسی شاعری کے بہت بڑے ماہر ہو گئے تھے مولانا حالی مرحوم نے مولانا کی فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ دستہ گل دیکھکر لکھا تھا کہ "کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبست سالک را

خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایمانہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا۔ الا الذی ابتلی بمثال ما ابتلی بہ القائل

میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ ہے اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں" ولیس ذالک شائبۃ من التصنع" حالی مرحوم کی اس تعریف و توصیف میں گو شائبہ تصنع نہ ہو لیکن ان کے

خلوص اور بیباک نفسی کو ضرور دخل ہے تاہم مولانا کی غزلوں کی متعلق پختگی زبان، صفائی و برجستگی بندش رفعت خیال اور بلندی مضامین سے انکار نہیں ہو سکتا۔

علیگڈھ کالج کی فضا میں قومی شاعری کی طرف بھی مولانا کی طبیعت کا رجحان ہو گیا تھا اور کئی قصیدے فارسی میں لکھے اردو نظموں میں تماشائے عبرت یعنی قومی مسدس خاص طور پر قابل ذکر ہے سرسید علیہ الرحمۃ نے اس غرض سے کہ غریب طالب علموں کے لئے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے ایک جلسہ قرار دیا تھا جس کی شان بظاہر ایک تھیٹر کی تھی اس جلسے کے لئے کوئی نظم یا نثر لکھنے میں چند مشکلات تھیں اول مسلمانوں کی حالت کا لحاظ رکھا جائے پرانے خیال کے لوگ جو تھیٹر کے نام سے مطعون کرتے تھے اور ہنسی اڑاتی تھے ان کو عبرت دلائی جائے مضامین وقت و موقع کے مناسب ہوں اور نظم یا نثر شاندار اور پر اثر ہو ان سب مشکلات سے پوری طرح دو شخص عہدہ برآ ہوئے نثر میں بصورت تقریر سرسید علیہ الرحمۃ اور نظم میں مولانا شبلی جو نظم و نثر اقتضائے وقت و حال سے کلیتاً مطابق ہوتی ہے ان میں یہ مسدس و تقریر بہترین نمونہ مثال ہیں دوسری سب سے زیادہ قابل تعریف نظم مولانا کی "بربادی خانمان شبلی" ہے

جو اپنے بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی وکیل ہائی کورٹ کا مرثیہ ہے۔ اہلِ بیت کے مرثیے تو اردو میں ایک سے ایک اعلیٰ موجود ہیں جو اردو زبان کا زیور ہیں لیکن اپنے کسی عزیز کی وفات پر اس مرثیہ سے بہتر کوئی مرثیہ اردو میں نہیں لکھا گیا۔

آخر میں مولانا نے اپنی شاعری کے لئے ایک نیا موضوع انتخاب کر لیا تھا جو ان کے مذاق اور فن کے بالکل مطابق تھا یعنی تاریخی شاعری۔ مولانا یہ افسوسناک واقعہ دیکھتے تھے کہ ہر موقع و محل پر جب شجاعت، غیرت، ہمت، غرض کسی کمال کا ذکر آتا ہے تو بجائے اسلامی ناموروں کے یورپ کے ناموروں کا نام لیا جاتا ہے اس واقعہ سے متاثر ہو کر مولانا نے الندوہ کے پہلے ہی نمبر میں "اخلاق عرب" ایک عنوان قائم کیا تھا جس میں استقلال ثبات و آزادی اور اخلاقی جرأت کے تاریخی واقعات لکھے تھے۔ افسوس کہ اس کا ایک ہی نمبر نکل کر رہ گیا لیکن مولانا نے بجائے نثر کے انہیں واقعات کو نظم کا جامہ پہنا دیا اور بہت خوبی سے یہ تاریخی واقعات نظم کئے ہیں صفائی، برجستگی، فصاحت، وغیرہ تمام خوبیاں اور شاعرانہ دل آویزی ان نظموں میں موجود ہے اور یہ ایسی نظمیں ہیں جن کی قدر و قیمت کبھی کم نہ ہو گی ان کے علاوہ سیاسی اور دوسری نظمیں جس قدر ہیں وہ بھی

بجائے خود دلچسپ ہیں کلیات شبلی ایک مجموعہ شائع ہو گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ مولانا کا تمام اردو فارسی کلام ایک جگہہ جمع کر دیا جائے صحیح نام اُسی کا کلیات شبلی ہو سکتا ہے

اخلاق و عادات - کمالات اور وفات

مولانا کی زندگی سرتاپا علمی زندگی تھی ان کا بہت کم وقت علمی تحقیقات تصنیف و تالیف اور مطالعہ کتب سے خالی جاتا تھا ان کی طبیعت میں استغنا اور خودداری کا خاص جوہر تھا ملازمت سے ان کو کچھ لگاؤ نہ تھا لیکن چونکہ جائداد پر قرض کا بار گران تھا جس سے تمام خاندان پریشان تھا اس لئے وہ ملازمت پر مجبور ہو گئے تھے حیدرآباد میں جب شعبۂ علوم و فنون کی نظامت پر مامور ہوئے تو اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں کہ "بے شبہہ میں ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے لیکن میاں سمیع عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا چند برسوں کے لئے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی ہے بلند ہی رہے - گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا ورنہ اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا"

ترک ملازمت کے بعد سنہ ۱۹۱۸ء میں جب گورنمنٹ نظام نے علوم شرقیہ کی یونیورسٹی کے قیام کا ارادہ کیا تو پھر مولانا کو اس کی نظامت معقول مشاہرہ کے ساتھ دینا چاہا لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا البتہ نصاب کی ترتیب کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور کئی مہینے کی مسلسل محنت کے بعد اس کا خاکہ تیار کر دیا۔

مولانا کے دو صفات سب سے نمایاں ہیں ایک کسبی اور ایک ذاتی کسبی ہیں ان کا فضل و کمال ہے ان کے نزدیک ہر دم علمی ذکر اذکار اور مسائل کا چرچا رہا کرتا تھا ان کی مجلس میں بیٹھنے والے بہت سے نئی معلومات لے کر اٹھا کرتے تھے اس کمال میں ان کا حافظہ بڑا معاون تھا جس کتاب کو وہ ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے اس کے کل مضامین ان کے مستحضر رہتے تھے ان کی وسعت نظر اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ علمی مذہبی فقہی اور تاریخی جس قدر سوالات آتے تھے ان کا جواب قلم برداشتہ لکھدیا کرتے تھے ان کے اس علم و فضل کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں تھی بلکہ روم و شام مصر و افغانستان انگلستان پیرس اور برلن تک تھی گورنمنٹ ہند سے ان کو انہیں علمی خدمات کے صلہ میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہوئے سنہ ۱۸۹۵ء میں

آلہ آباد یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس اور بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر مقرر ہوئے ۱۹۰۸ء میں اڈنبرا مسلم سوسائٹی کے پریسیڈنٹ ہوئے ۱۸۹۹ء میں امیر افغانستان نے انگریزی علوم و فنون کے ترجمہ کا ایک محکمہ قائم کیا تھا جس کی معتمدی پر مولانا کا انتخاب کیا گیا لیکن مولانا کو پابندی کے ساتھ کلکتہ میں رہنا پسند نہ تھا اس وجہ سے انکار کر دیا لیکن مسٹر جین کا انتخاب مولانا ہی کے ذریعہ ہوا ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے شملے پر ایک مشرقی کانفرنس قائم کی تھی اس میں مولانا ہی مدعو کئے گئے تھے مصر، شام، ٹرکی، جزائر ملایا، انگلستان، پیرس اور برلن سے مولانا کے پاس علمی استفتے اور سوالات آیا کرتے تھے مسٹر آر۔ تلڈ انگلستان میں مسیو بواپیرس میں اور ڈاکٹر محمود لبیب برلن میں بیٹھے ہوئے مولانا سے علمی استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہ شہرت مولانا کے معاصرین میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوئی

ذاتی نمایاں صفات میں مولانا کی ایک صفت ایثار ہے ان کی تصانیف کا مقصد صرف قوم کا فائدہ تھا چنانچہ کثیر التعداد تصانیف سے جن میں بعض کے کئی کئی اڈیشن نکلے انہوں نے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ یا تو انہوں نے مدرسۃ العلوم علیگڈھ یا ندوہ یا اپنے احباب میں سے کسی کو اس کا حق تصنیف

عطا کر دیا دار المصنفین کے لئے جس قدر جائداد مولانا نے وقف کی
اس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے نایاب اور قلمی کتابوں کا مولانا کو
بے حد شوق تھا صدہا روپیہ ایک ایک کتاب کی قیمت دیکر
خریدتے تھے جب کوئی نادر و نایاب کتاب بہم پہنچتی تو ان کی
خوشی و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی اس کی اطلاع اپنے
علم دوست عزیزوں اور احباب کو دیتے تھے جو کتابیں قیمتاً
نہ مل سکتیں یا ان کی قیمت استطاعت سے زیادہ ہوتی تو
حتی الامکان معقول معقول اجرتوں پر نقل کرا لیتے تھے لیکن یہ
محبوب ترین ذخیرہ بھی انہوں نے ندوہ کو اور دار المصنفین کو
نذر کر دیا۔ یہ ایثار کیا کم ہے کہ حیدر آباد کی ملازمت محض قوم کیلئے
چھوڑی اور قومی خدمات کے لئے بلا کسی ذاتی نفع کے اپنی زندگی
کلیتاً وقف کر دی

اپنے اعزا اور اقربا سے انتہائی محبت بھی مولانا کی خاص
صفت تھی مولانا کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بیوی کے انتقال سے
پانچ سال کے بعد دوسرا عقد کر لیا تھا دو اولادیں تھیں ایک
صاحبزادی فاطمہ خانم اور ایک صاحبزادے حامد مہدی اور مولوی
محمد اسحق اور جنید حقیقی بھائی اور مولانا حمید الدین صاحب ماموں

زاد بھائی تنہا ان سے اور دوسرے عزیزوں سے مولانا بے حد محبت کرتے تھے ۱۸۹۰ء میں مولانا کے منجھلے بھائی مھدی نے انتقال کیا تو مولانا کو بیحد صدمہ ہوا۔ اس واقعہ کی اطلاع میں اپنے ایک عزیز کو جو خط لکھا ہے۔ وہ درحقیقت نثر میں ایک دردناک مرثیہ ہے۔

"لو بھائی ہم میں کا ایک عنصر کم ہوگیا عزیزی مھدی نے جان دی اور کس حالت کے ساتھہ کہ کلیجے کے ٹکڑے اُڑ گئے

میں بدبخت پاس تھا اور اس لیئے جتنے تیر پھینکے سب میرے ہی جگر پر لگے، ہائے اس کی جوانہ مرگی! ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اسقدر جلد دنیا سے جائیگا ورنہ مجھہ پر لعنت اگر میں اس سے ناراض رہتا۔ ہائے سب بُرائیوں پر وہ سب سے اچھا تھا، آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا۔ سو بار رو چکا ہوں اور دل نہیں ٹھہرتا اس کی ایک محبوب یادگار ہے جس کو وہ ببن کہتا تھا یعنی شافیہ اس سے بارہا لپٹ کر رو دیا ہون لیکن کچھہ بھی تو تسلی

نہیں ہوتی اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں لیکن خود بے قرار
ہو جاتا ہوں ایک اور اس کے نام سے وابستہ
بدقسمت ہے جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی لیکن اب
پیاری بہن ہے۔

تم لوگ مرنے سے باہر ہو۔ ہاں آفت زدوں کو
سنبھال میں کے سر چھوڑا ہے ہائے مہدی ہائے مہدی

بدبخت ازلی

شبلی نعمانی ۲۔ جولائی ۱۸۹۷ء اعظم گڈھ

۱۹۰۷ء میں اتفاقاً مولانا کے پیر میں بندوق کی گولی
لگ گئی تھی جس کے علاج سے پاؤں درست نہ ہوا اور کاٹ ڈالا گیا
مولانا نے ایک مصنوعی پاؤں پڑھوا لیا تھا اس حادثہ سے مولانا کی جان تو
سلامت رہ گئی لیکن قویٰ ضرور مضمحل ہو گئے تھے ۱۹۱۴ء میں
مولوی محمد اسحق صاحب کا انتقال ہو گیا یہ ایسا صدمہ تھا کہ
مولانا اس سے جانبر نہ ہو سکے اور ان کی وفات سے
چند ہی مہینے کے بعد پندرہ روز بستر علالت پر رہ کر ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء
۲۸۔ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو ۵۷ برس کی عمر میں مولانا نے داعی اجل کو
لبیک کہا خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

عجم کی مدح اور عباسیوں کی داستان کے بعد مدح النبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تصنیف میں ہمہ تن مصروف تھے اسی پر خاتمہ بالخیر ہوا جیسا کہ مرحوم خود فرما گئے ہیں ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

شمسی مشین پریس آگرہ میں محمد بشیر الدین خان کے اہتمام سے چھپایا گیا

Date	No.	Date	No.